© rasailojaraid.com

اقبال اور اسلامی اُمہ

پروفیسر شکیل پتافی
اسسٹنٹ پروفیسر (شعبہ اُردو) گورنمنٹ کالج، راجن پور

برصغیر کے مسلمانوں کی قومی تاریخ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی بڑی انقلاب انگیز رہی ہیں۔ مشرق و مغرب کے عروج و زوال کے ساتھ ہی جدیدیت کا آغاز ہوا جس کے تحت ایک طرف نئی طرز فکر، جدید سائنسی تحقیقات اور نئے عزائم سامنے آرہے تھے اور دوسری طرف مسلمان دینی اور اخلاقی زوال کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ان کی سیاسی قوت پارہ پارہ ہوتی جارہی تھی۔ وہ مغرب کے افکار و تہذیب سے مرعوب اور خوف زدہ ہورہے تھے۔ سیاسی طور پر مغربی سامراج کا اقتدار انہیں اپنے نرغے میں لے رہا تھا اور مسلمان محکومی، پستی اور دین سے دوری کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ مغربی تہذیب کی حاکمانہ برتری نے عوام و خواص سب کے ذہنوں کو زبرست ذہنی غلامی سے دوچار کردیا تھا۔ ہندوستان پر مسلمانوں کا اقتدار تو قائم تھا لیکن ان میں ملی تصور کا اتنا فقدان تھا کہ مختلف ریاستوں کے مسلمان نواب، مرکزی حکومت کو کمزور کرنے کے درپے ہوگئے تھے۔ دکن میں نظام الملک اور ارکاٹ کے نواب عملاً خود مختار ہوگئے۔ میسور میں حیدر علی نے اپنی الگ سلطنت قائم کرلی، بنگال اور بہار میں مغلوں کا اثر برائے نام باقی رہ گیا۔ فرخ آباد اور روہیل کھنڈ میں بھی عملاً خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں۔ ۱۷۳۹ء کے بعد پنجاب، سندھ اور کابل کا شمار ایرانی مقبوضات میں ہونے لگا۔ نوابانِ اودھ نے بھی اپنی بساط الگ بچھالی۔ حتیٰ کہ دہلی سے جنوب مغرب کی طرف راجپوتوں اور مرہٹوں نے مسلمانوں پر اپنی بالادستی قائم کردی۔ اسلامی قوت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح پارہ پارہ ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں امت کا تشخص پیدا نہیں ہو سکا اور وہ مختلف فرقوں اور گروہ بندیوں میں بٹ کر رہ گئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ۔ (البقرہ:۱۴۳)

ترجمہ: ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک ''اُمتِ وسط'' بنایا ہے''۔

اللہ کے احکام کی روگردانی کی سزا یہ ملی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا اور انگریزوں کو اس انتشار سے بھرپور فائدہ حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ سید عابد علی عابد کے مطابق:

> ''انگریزوں نے اسلامی طاقت کے انتشار سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ خود مختار اسلامی ریاستوں کو یا تو باہم برسرپیکار رکھا جائے .... یا چند ریاستوں کو اپنے ساتھ ملا کر انہیں طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر دوسری ریاستوں کے خلاف صف آراء ہونے کی ترغیب دی جائے مقصد دونوں صورتوں میں ایک تھا یعنی اس برصغیر میں اسلامی اقتدار کا استیصالِ کلی''۔(۱)

برصغیر کے مسلمان انگریزی سازشوں کو نہ تو بھانپ سکے اور نہ ہی اپنے اندر اجتماعی تصورات پیدا کر سکے۔ زوال کی موجِ خوں سر سے گزر گئی اور مسلمان طاقت اور حاکمیت سے محروم کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی رہی سہی ساکھ ختم ہوگئی اور وہ کلیتاً انگریزی غلامی میں جکڑ لیے گئے۔ ان حالات میں فرد کے سامنے نیا نصب العین صرف ذاتی اغراض وخواہشات کی تکمیل رہ گیا اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطہ اخلاق ملکی اور قومی زندگی کے لیے باقی نہ رہا۔

انگریزوں کے آنے کے ساتھ ہی ہندوستان میں سیکولرازم، اشتراکیت اور فسطائیت جیسے نظریات نے جنم لیا اور ان کے اثرات نے مسلمانوں کی نام نہاد وحدت میں کئی خلا پیدا کر دیئے۔ سیکولرازم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز اگرچہ ۱۸۳۲ء میں اس وقت ہوا جب جیکب ہولیک نے سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کی تحریک قائم کی(۲)۔ لیکن مغرب کے توسط سے یہ نظریات بڑی تیزی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ ہندوستان میں داخل ہو کر ذہنی بے اطمینانی' روحانی اضطراب' جذباتی تلون اور بے عقیدگی کا باعث بنے۔ اس صورتِ حال میں مسلمان فکری اعتبار سے تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرنے لگے۔ سر سید کو سب سے پہلے اس ملی انتشار کا شعور حاصل ہوا اور انہوں نے مسلمانوں کو کسی حد تک ایک محور و مرکز پر جمع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں.

اقبال کے زمانے میں یہ انتشار اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور انہوں نے مسلمانوں کی بیداری اور دین کی طرف ان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ وہ قرآن و سنت اور علومِ اسلامیہ کے دیگر سر چشموں سے علم و عرفان کا نور حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مغربی فکر و فلسفہ کی تہہ تک پہنچے ہوئے تھے۔ اس بنا پر انہوں نے اولاً اسلامی فکر کی تشکیل جدید کی اور ثانیاً مسلمانوں میں اسلامی امت کا تصور اجاگر کیا۔ ان کے خیالات نے برعظیم کے مسلمانوں میں اتحاد اسلامی کے جذبات کو تقویت پہنچائی۔ وہ ملتِ اسلامیہ کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا عزم و حوصلہ لے کر میدانِ عمل میں اُترنے اور مسلمانوں کے اندر آزادی و عظمت کے حصول کے لیے متحد رہنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ ۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کو لاہور کے ایک جلسہء عام کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا۔ راتیں غور و فکر میں گزاریں تا کہ وہ حقیقت معلوم کر سکوں جس پر کار بند ہو کر عرب' حضور سرور کائنات ﷺ کی محبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے۔ کاش! ہر مسلمان کے دل میں اُتر جائے''(۳)۔

چنانچہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی اور تنزلی کا واحد حل امتِ مسلمہ کے اتحاد و یکجہتی میں مضمر ہے۔ بقول معین الدین عقیل:

''انہوں نے دنیائے اسلام کے ناقابلِ تقسیم ہونے کا خیال پیش کیا اور جدید حالات کے مطابق عالمِ اسلام کے اتحاد پر زور دیا...... خواہ یہ اتحاد عالم گیر ریاست کی صورت میں ہو' اسلامی ریاستوں کی ایک صورت ہو یا متعدد آزاد ریاستوں کی صورت میں ہو جن کے معاہدات اور میثاقات خالص معاشی و بنیادی مصلحتوں پر مبنی ہوں''(۴)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلامی اُمہ کے قیام کے لیے اقبال کا پیغام ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو خواہ وہ کسی بھی خطہء زمین میں بستے ہوں' ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک امت کے افراد تصور کرتے تھے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ' (الحجرات:۱۰) کا نظریہ ان کے نزدیک اتحادِ اُمت کی بنیاد تھا' جسے وہ جماعتی زندگی میں عملاً نافذ کرنے کے داعی تھے۔ایک سچے عاشقِ رسول ﷺ ہونے کے ناطے حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی اقبال کے پیش نظر تھا:

فَاِنَّہٗ مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَۃَ شِبْرًا فَمَاتَ اِلَّا مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً. (صحیح بخاری۔ کتاب الفتن' ۲۱۸۷)

ترجمہ: ''جو شخص جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہو جائے گا اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی''۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ جماعت سے یکسر الگ ہو جائے بلکہ یہ بھی کہ اگر جماعت کے فیصلوں سے بالشت بھر بھی الگ ہو جائے تو بھی اس کی موت مسلمانوں کی موت نہیں:

یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وَ مَنْ شَذَّ' شُذَّ فِی النَّار (مقدمہ'ابن ماجہ)

ترجمہ: ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں گرا''۔

اقبال کے الفاظ میں:

ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ (۵)

اقبال کے پیش نظر امتِ مسلمہ کا عالمگیر تصور تھا۔ان کے نزدیک تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم کے اجزاء تھے۔جس طرح نسلی وابستگی کی بنا پر مسلمانوں کی الگ الگ قومیت کا تصور خلافِ اسلام ہے' اسی طرح جغرافیائی حدود کی بناء پر ان کی جداگانہ قومیتوں کا نظریہ بھی دین کی نقیض ہے۔ اقبال نے اپنے اس پیغام کو ہندوستان کی چار دیواری سے آگے لے جا کر پورے عالمِ اسلام تک پھیلا دیا' فرماتے ہیں:

''وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل' زبان اور رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے ''اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہ'' کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا، جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے''(۶)۔

۱۹۲۲ء میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد ترکی سمیت تمام مسلم ممالک کی حالت بڑی افسوس ناک حد تک زبوں حالی کا شکار ہوگئی تھی۔ اس موقع پر اقبال نے ''خضرِ راہ' کے ذریعے عالم اسلام کو مخاطب کر کے اس نکبت و زبوں کا ایک ہی علاج تجویز فرمایا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خون مٹ جائے گا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی — اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گزر (۷)

اس سے اگلے سال ۱۹۲۳ء میں انہوں نے اپنی مشہور نظم ''طلوعِ اسلام'' میں تمام اسلامی اُمہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

ہوس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے نوعِ انساں کو — اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے — تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا(۸)

اس سے قبل ۱۹۱۲ء کی جنگِ طرابلس میں فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک عرب لڑکی غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوگئی تو اقبال نے اس کی یاد میں جو نظم کہی اس میں انہوں نے فاطمہ کو عربی نسل یا طرابلسی قوم کے لیے باعث فخر نہیں کہا بلکہ اسے امت مسلمہ کی عزت و آبرو کہا ہے:

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یا رب اپنی خاکستر میں تھی
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں — پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں (۹)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال کے نزدیک ایک لڑکی کی شہادت گویا ایک قوم کی زندگی کا پیش خیمہ ہے جس سے قومیت کا تصور اجاگر ہوتا ہے۔

اقبال کی بعض نظمیں مثلاً ہمالہ، تصویر درد، ترانہء ہندی، نیا شوالہ، وغیرہ ان کی وطن پرستی کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں اور بعض نقادوں نے انہیں وطن پرست شاعر ظاہر کیا ہے (۱۰)۔ حالانکہ اس دور میں ملک کو سامراجی تسلط سے آزاد کرانے کے اور ملکی سالمیت کے تصورات عام ہو رہے تھے۔ اقبال بھی ایک حساس اور دردمند دل رکھتے تھے۔ وہ بھی ان عصری حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ دراصل وہ نظریہ وطنیت میں مسلمانوں کی بھلائی تصور کرتے تھے۔ وہ وطن کے جغرافیائی مفہوم کے قائل تھے اور اسے انسان کی اخلاقی زندگی کا جز و قرار دیتے تھے لیکن اسے مذہب پر فوقیت نہیں دیتے تھے۔ لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کانفرنس کے خطبہ صدارت میں انہوں نے واضح کر دیا تھا:

''حب وطن ایک فطری امر ہے اور اسی لیے انسان کی اخلاقی زندگی کا ایک جزو ہے۔ لیکن جو شے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ انسان کا مذہب' اس کا تمدن اور اس کی ملی روایات ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لیے انسان کو زندہ رہنا چاہیے اور جن کی خاطر اپنی جان قربان کرنی چاہیے'' (۱۱)۔

۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ گئے اور قیامِ یورپ کے زمانے میں انہوں نے مشاہدہ کیا کہ وطن کا مغربی سیاسی تصور' عالمِ انسانیت کی تذلیل اور تباہی کا باعث ہو رہا ہے۔ انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ اسلام نے وطنیت اور وطن پرستی کے اس تصور کی نفی کی ہے۔ اس لیے اسلامی تعلیمات اور عالم گیر انسانی برادری کے جذبے کے تحت انہوں نے سارے عالمِ اسلام کو اُمتِ مسلمہ کا وطن قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا ٭ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا (۱۲)
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ٭ جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے (۱۳)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یورپ کے نظریہ وطن پرستی پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

''نیشنلزم کا یہ عقیدہ یورپ میں کلیسائی نظام کی شکست وریخت اور اس کے بعد کی مشینی اور صنعتی رقابتوں سے ابھرا اور اس سے وحدت کے وسیع تر دائرے جو مذہبی عقیدے سے قائم ہوئے تھے، سمٹ سکڑ کر محدود تر ہوتے گئے''(۱۴)۔

اقبال نے نیشنلزم کے اس جغرافیائی تصور کو نفرت آفریں اور عداوت خیز سمجھ کر رد کر دیا اور اس بات پر زور دیا کہ قومیت کی حقیقی و تعمیری اساس کلمہ توحید ہے جس کا استحکام نظامِ رسالت ﷺ نے کیا ہے...... ان کے نزدیک زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں رنگ وخوں کی تفریق انسانیت کے لیے ایک لعنت سے کم نہیں۔ اقبال نے اس رویے کو فطرت کے منافی قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک جو بات مقصودِ فطرت ہے وہ جذبہ ملی ہے جس میں رنگ وخوں کا امتیاز باقی نہیں رہتا:

یہی مقصود فطرت ہے، یہی رمز مسلمانی اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتان رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی (۱۵)

یورپ کے نظریہ وطنیت پر تنقید کرتے ہوئے اقبال نے ایک مقام پر فرمایا:

''میں یورپ کے نظریہ وطنیت کا مخالف ہوں' اس لیے نہیں کہ اگر اسے ہندوستان میں نشو ونما پانے کا موقع ملے تو مسلمانوں کو مادی فوائد کم پہنچیں گے۔ بلکہ میری مخالفت اس بناء پر ہے کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں جو میرے نزدیک انسانیت کے لیے ایک عظیم ترین خطرہ ہے''(۱۶)۔

اس لیے مسلمانوں کو ملت اقوامِ مغرب سے دور رہنے کا درس دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اقبال چونکہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اس لیے انہیں نظریہ وطنیت میں مسلمانوں کے لیے ایک عظیم خطرہ نظر آیا۔ اس کے برعکس اقبال کا نظریہ قومیت خالصتاً اسلامی اور قرآن وسنت کے عین مطابق ہے:

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں (۱۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال کے نظریہ قومیت کے بارے میں قاضی احمد میاں اختر رقمطراز ہیں:

''اقبال کا نظریہ قومیت تمام تر احکام الٰہی اور ارشاداتِ نبوی ﷺ کے تحت ایک ایسے انسانی معاشرہ پر قائم ہے جو نسلی امتیازات اور ملکی و وطنی بندشوں سے آزاد ہے جن کو اسلام نے مٹادیا ہے'' (۱۸)۔

۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی نے دہلی کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں'' (۱۹)۔ تو مرض الموت میں مبتلا ہونے کے باوجود اقبال کے دل صد چاک سے ایک آہ اُبھری جو ان الفاظ کی شکل میں فضا کو چیرتی ہوئی سوئے افلاک تک جا پہنچی:

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است　　چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است (۲۰)

ان اشعار میں ''بمصطفیٰ برساں خویش را'' کے الفاظ گہری معنویت کے حامل ہیں۔ یعنی خدا کی طرف سے دین ملتا ہے جبکہ امت کی تشکیل اس رسول ﷺ کی طرف نسبت ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا ہے اور اس کے مطابق ایک معاشرہ تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کی پیرو ''امتِ محمدیہ'' کہلاتے ہیں۔ خواہ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں کیوں نہ ہوں وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس سلسلے میں نہ عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ ہی گورے کو کالے پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ اگر امت کی اساس وطن یا نسل قرار پائی جائے تو رسول ﷺ سے نسبت ختم ہو جاتی ہے اور جب رسول ﷺ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر دین باقی نہیں رہتا۔ اس حقیقت کو قرآن کی یہ آیت مبارکہ واضح کرتی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (الانعام:۱۵۹)

ترجمہ: ''بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لیے اور گروہ گروہ بن گئے، اے رسول ﷺ! آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں''۔

اقبال نے وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے اپنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رشتہ منقطع کر کے "تمام بولہبی است" کے مترادف قرار دیا ہے۔ اقبال کی وسعت نظری میں وطن پرستی کی گنجائش موجود نہیں کیونکہ ایک تو یہ تصور مغرب کا آوردہ ہے دوسرا یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ میں تصورِ وطن کبھی بھی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں رہا۔ "ہر ملک ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست"(۲۱) کے مصداق مسلمان جب عرب سے نکلے تو ہندوستان سے لے کر اسپین تک انہوں نے ہر جگہ کو اپنا وطن بنایا۔ ان کے لیے خدا کا تصور کسی قطعہ ارضی یا مخصوص حدود کا پابند نہ تھا۔ بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑانے کی روایت ان کے جذبہ ملی کا بین ثبوت ہے اس لیے مسلمانوں کی اس نہج کو سمجھتے ہوئے اقبال ہمیشہ قید مقام سے گزر جانے کا درس دیتے ہیں۔

تو ابھی رہگزر میں ہے قید مقام سے گزر مصر وحجاز سے گزر، پارس وشام سے گزر
کوہ شگاف تیری ضرب، تجھ سے کشادہ شرق وغرب تیغ ہلال کی عیش نیام سے گزر(۲۲)
اگر قومیت اسلام پابند مقام ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام(۲۳)

اس نظریے کی تائید میں فارسی اشعار ملاحظہ ہوں:

جوھر ما با مقامے بستہ نیست بادہء تندش بجامے بستہ نیست
قلب ما از ہند وروم وشام نیست مرز بوم او بجز اسلام نیست(۲۴)

اقبال نے مسلمانوں میں ملی وحدت پیدا کرنے کے لیے حرکی نظریے کو عام کیا ہے۔ وہ مسلسل حرکت کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور تحرک کو وطن کی جغرافیائی حدود میں مقید کیے بغیر مسلمانوں کو مسلسل تگ ودَو کے ذریعے مقاصد کے حصول کا مژدہ سناتے ہیں۔ اسی میں اجتماعیت کا رجحان پروان چڑھتا ہے اور اسی میں فرد کا نہیں بلکہ قومی مفاد مضمر ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

> "علامہ اقبال کے لیے اجتماعیت' قومی مفاد یا ملی مقاصد کے مترادف ہے اور اسی لیے علامہ نے ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو ایک وحدت میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے"۔(۲۵)

اقبال کا تصورِ خودی بھی درحقیقت حرکت پزیری کی بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔ جہد مسلسل سے فرد خودی کی ارفع منازل طے کرتا ہے اور اجتماعی دھارے میں شامل ہو کر امت کی جان بن جاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اس کا انفرادی تشخص بھی قائم رہتا ہے اور ملت کے مرکز کے ساتھ اس کا رابطہ بھی استوار رہتا ہے۔ اقبال کے مطابق:

فرد قائم ' ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں (۲۶)

الماوردی کی تائید میں مسلمانوں کے لیے اقبال نے ایک مرکز پر بھی غور کیا تھا (۲۷) اسی لیے مرکز سے جدائی اقبال کے نزدیک موت ہے:

قوموں کے لیے موت ہے مرکز سے جدائی
ہو صاحب مرکز تو خودی کیا ہے' خدائی (۲۸)

یہی مرکز' اسلامی اُمہ کا قیام ہے اور اسی اسلامی اُمہ کے قیام کے لیے اقبال نے خودی کا راستہ اختیار کرنے کی جو بار بار تلقین کی ہے اس میں امتِ مسلمہ کی فلاح کا راز مضمر ہے۔ اقبال جانتے تھے کہ خودی انسانوں کو مذہب سے جوڑتی ہے اور مذہب انسانوں کو اُمت کی شکل میں ڈھال دیتا ہے اور یہ اُمت کسی جغرافیائی خطے سے ماورا ایک ایسے عالمگیر مرکز کی نشاندہی کرتی ہے جس کی حدیں زمین و آسماں تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

خودی کی خلوتوں میں کبریائی   خودی کی جلوتوں میں مصطفائیؐ
زمین و آسمان و کرسی و عرش   خودی کی زد میں ہے ساری خدائی (۲۹)

خودی کے حرکی نظریے پر بحث کرتے ہوئے نصیر احمد ناصر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال نے خودی کی اس صفت کی طرف خصوصیت سے اشارہ کیا ہے کہ وہ ثابت سیار ہے' یعنی وہ حرکتِ مدام کی حالت میں رہتی ہے۔ خودی کے متعلق اُن کا یہ حرکی نظریہ فلسفے میں از بس اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تصور فی الحقیقت قرآن حکیم ہی کا ہے' جس کے نزدیک خودی مطلق ہر لحظہ ایک نئی شان میں رہتی ہے''۔ (۳۰)

اقبال نے اس حقیقت کی طرف بصیرت افروز اشارہ ان اشعار میں کیا ہے:

درون سینۂ آدم چہ نوراست   چہ نوراست ایں کہ غیب او حضور است

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

من اورا ثابت سیار دیدم من او را نور دیدم نار دیدم(۳۱)

اقبال کے نزدیک جب ایک مسلمان خودی کے مراحل طے کرتا ہے تو اس میں ایک ایسی حرکی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے قرب خداوندی کی لذتوں سے آشنا کر دیتی ہے اور خودی کا وجود بھی وجودِ حق کے پرتو سے امر ہو جاتا ہے۔ یہی اسلامی اُمہ کی معراج ہے کیونکہ اقبال کے نزدیک:

خودی را از وجود حق وجود ہے خودی را از نمود حق نمودے
نمی دانم کہ ایں تابندہ گوہر کجا بودے اگر دریا نبودے (۳۲)

ڈاکٹر یوسف حسین خان نے اقبال کے حوالے سے زندگی کو ایک مسلسل حرکت سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا محرک خودی ہے۔ ان کے مطابق:

''اقبال کہتا ہے کہ زندگی کا اصل محرک اثباتِ خودی کا جذبہ ہے جو انسان میں ودیعت ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو نت نئی خواہشوں کی تخلیق کرتی ہے اور اس طرح اپنی توسیع و بقا کا سامان مہیا کرتی ہے۔ وہ پیہم عمل اور کشمکش سے لازوال ہو جاتی ہے''۔(۳۳)

اقبال نے خود اس حقیقت کو ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' میں ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

''بایں ہمہ بزمِ ہستی میں ہر کہیں خودی ہی کا نغمہ لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہا ہے اور ذاتِ انسانی میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بھی تو اسی لیے حقیقت مطلقہ کو انسان کی رگِ جان سے قریب تر ٹھہرایا۔ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد (۱۶:۵۰) کیونکہ یہ حیاتِ الٰہیہ ہی کا سیلِ رواں ہے جو ہمارے وجود کا سرچشمہ ہے اور جس میں ہم موتیوں کی طرح پیدا ہوتے اور زندگی بسر کرتے ہیں''۔(۳۴)

اقبال کے اس فرمان میں انسانی وجود کا حیاتِ الٰہیہ کے سیلِ رواں سے موتیوں کی طرح پیدا ہونا از خود اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ احکاماتِ الٰہی کی پیروی میں انسان اجتماعی دھارے میں شامل ہو جاتا ہے۔ جس سے امت وجود میں آتی ہے۔ جس طرح بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرونے سے ہار بن جاتا ہے۔ اسی طرح اقبال نے حرکی قوت کے ذریعے سے خودی کے مراحل طے کرتے ہوئے قربِ الٰہی سے سرشاری کا تصور پیش کر کے اسلامی اُمہ کے قیام کی راہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دکھائی ہے۔ یہی اقبال کا مقصود اولیں تھا۔ وہ اسی لیے وطن کی جغرافیائی حدود کو عارضی اور مومن کے وجود کو دائمی قرار دیتے ہیں، فرماتے ہیں:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے نشہء مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیٔ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے عصر نو رات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے(۳۵)

اقبال کے نزدیک اسلامی اُمہ کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ غلامی ہے۔ انفرادی یا اجتماعی سطح پر غلامانہ زنجیروں میں جکڑے رہنے سے نہ تو انسان کی خودی نشو ونما کے ارفع مراحل طے کر سکتی ہے اور نہ ہی اس میں اجتماعیت کا شعور بیدار ہو سکتا ہے۔ ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جب انسان میں خوے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو''(۳۶)۔

جس طرح حق و باطل، خیر و شر، نیکی و بدی اور توحید و شرک ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، اس طرح مسلمان اور غلامی کا اجتماع بھی ایک امرِ محال ہے۔ اقبال کے نزدیک جس دل میں ایمان و یقین ہے وہاں اغیار کی غلامی کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے برعکس جو اپنے آپ کو مسلمان کہے اور اغیار کی غلامی و اطاعت پر رضامند بھی ہو اس کا دل ایمان و یقین سے خالی ہوتا ہے خواہ حافظِ قرآن ہی کیوں نہ ہو:

از غلامے لذتِ ایماں مجو
گرچہ باشد حافظِ قرآں، مجو(۳۷)

اقبال کے نزدیک غلامی اور محکومی بہت بڑی لعنت ہے(۳۸)۔ اس لیے وہ غلامانہ زندگی کو بے روح بدن کی مانند قرار دیتے ہیں۔ جس میں دل مردہ ہو جاتے ہیں اور جوانی میں ضعفِ پیری لاحق ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں بزمِ ملت کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے، فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

از غلامی دل بمیرد در بدن — از غلامی روح گردد بارِ تن
از غلامی ضعف پیری در شباب — از غلامی شیر غاب افگندہ ناب
از غلامی بزم ملت فرد فرد — این و آں با این و آں اندر نبرد (۳۹)

اقبال کے زمانے میں امتِ مسلمہ کے عقائد و افکار کی توانائی اور صحت مندانہ فکر کو جو چیز دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی وہ عجمی تصوف کا فروغ و نفوذ تھا۔ یہ وحدت الوجودی تصوف فارسی اشعار کے ذریعے اُردو ادبیات میں داخل ہوا اور پھر مسلمانوں کے ذہنی سرمائے کا ایک نہایت اہم جزو بن گیا۔ اقبال نے عمر بھر تصوف کے اس منفی پہلو کی مخالفت کی کیونکہ وہ اسے اسلامی اُمہ کے لیے زوال کا باعث قرار دیتے تھے۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے مطابق :

''علامہ اقبال کے کلامِ نظم و نثر سے ثابت ہے کہ وہ وحدت وجودی کے قائل نہ تھے بلکہ اسے افکارِ اسلامی میں مسلمانوں کے ذہنی زوال کا ایک سبب جانتے تھے'' (۴۰)

اقبال کو صوفیاء کے مسئلہ وحدت الوجود سے خاص طور پر اس لیے اختلاف تھا کہ ان کے نزدیک اس عقیدے نے تمام امتِ مسلمہ کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا ہے جس سے اسلامی اُمہ کا قیام تو دور کی بات ہے فرد واحد کی مجاہدانہ صلاحیتیں بھی مفقود ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ تصوف کے وجودی فلسفے کے نہ صرف مخالف تھے بلکہ اسے خلافِ اسلام قرار دیتے تھے۔ سید فصیح اللہ کاظمی کے نام اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۱۰ رجولائی ۱۹۱۶ء) میں لکھتے ہیں :

''میرے نزدیک تصوفِ وجودی مذہب اسلام کا کوئی جزو نہیں بلکہ مذہب اسلام کے خلاف ہے اور یہ تعلیم غیر مسلم اقوام سے مسلمانوں میں آئی ہے'' (۴۱)۔

اسی طرح سید یامین ہاشمی کے نام اپنے ایک خط میں عجمی تصوف کو عالمِ اسلام کی تباہی کا باعث قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں :

''میری رائے میں عجمیت ' ایشیا کے مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی ہے' اس وقت اس ' باطل ' کے خلاف جہاد کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے' عجمیت کا اثر مذہب ' لٹریچر اور عام زندگی پر غالب ہے'' (۴۲)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اقبال عجمی تصوف کے مقابلے میں اسلامی تصوف کے حامی تھے۔ وہ اسلامی تصوف کو قلبی قوت قرار دیتے تھے جس سے انسان میں حرکت وعمل اور جہد مسلسل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اسی میں ملت اسلامیہ کی بقا کا راز مضمر ہے۔ چنانچہ ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں اکبر الٰہ آبادی کو وضاحتاً لکھتے ہیں:

''عجمی تصوف سے لٹریچر میں دلفریبی اور حسن وچمک پیدا ہوتا ہے مگر ایسا کہ طبائع کو پست کرنے والا ہے۔ اسلامی تصوف دل میں قوت پیدا کرتا ہے اور اس قوت کا اثر لٹریچر پر ہوتا ہے۔ میرا تو یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کا لٹریچر تمام ممالک اسلامیہ میں قابلِ اصلاح ہے Pessimistic Literature کبھی زندہ نہیں رہ سکا' قوم کی زندگی کے لیے اس کا اور اس کے لٹریچر کا Optimistic ہونا ضروری ہے''(۴۳)۔

ثابت ہوا کہ اقبال تصوف کو دو شاخوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک تصوف ناامیدی' مسکینی' سہل انگاری اور عجز وناتوانی کی تعلیم دیتا ہے۔ دوسرا تصوف جوش' ولولہ اور حرکت وحرارت کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اوّل الذکر تصوف کو عجمی قرار دیتے تھے اور اس کی مخالفت کرتے تھے اور ثانی الذکر کو اسلامی تصوف کہہ کر اس کی تلقین کرتے تھے۔ ''فقر'' تصوف کا ایک اہم عنصر ہے اور اقبال نے اس نظریے کی وضاحت فقر کی دو شکلوں کی صورت میں اس طرح کر دی ہے:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری — میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری (۴۴)

اقبال کے صوفیانہ نظریات سے واضح ہے کہ وہ قرآنی اصولِ واقدار کی روشنی میں رسول اکرم ﷺ کے پیش کردہ عملی اور مجاہدانہ اقدام کے حامی تھے اور قرآن وسنت کی روشنی میں مواخاتِ مدینہ جیسی اسلامی ریاست کا قیام چاہتے تھے۔ ایک ایسی ریاست جو رنگ ونسل اور طبقاتی امتیازات سے ماورا ہو کرامتِ مسلمہ کی آئینہ دار ہو۔ قرآنی فکر کے حوالے سے علامہ پرویز نے ملتِ اسلامیہ پر اقبال کے احسان کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''حضرت علامہ کا ملتِ اسلامیہ پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے قرآنی اقدار اور نظام کو نہایت بلیغ، حسین اور موثر انداز مین عام کرنے میں اپنی عمر صرف کر دی۔ اس میں ان کی حقیقی عظمت کا راز مضمر ہے............ ان کی یہ فکر امت کے قلب و نگاہ میں انقلاب کے متقاضی ہے اور انقلاب بڑی حوصلہ طلب کشمکش، صبر آزما، ہمت اور جہادِ مسلسل چاہتا ہے۔ اس کے برعکس تصوف، بیٹھے بٹھائے فریبِ سکون کی ''جنت'' کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس کا خود علامہ کو بھی احساس تھا''۔(۴۵)

اس میں شک نہیں کہ اقبال قرآنی فکر کے پروردہ تھے اور قرآن سے ان کا ربط سچا اور والہانہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سچے عاشقِ رسول ﷺ بھی تھے۔ یہی دو چیزیں اقبال کی شخصی و فکری زندگی کا اثاثہ تھیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے مطابق:

''عشقِ رسول ﷺ اور قرآن مجید ہی سے علامہ اقبال کی شخصی عناصر (Personal Elements) کی تعمیر ہوئی ہے اور اس اجمال کی تفصیل ان اقوال و احوال میں پیش کی جاتی ہے جو مختلف کتابوں میں بکھرے ہوے ہیں''۔(۴۶)

اقبال کی اپنی کتابوں سے واضح ہے کہ اسلامی اُمہ کا تصور انہوں نے قرآنی تعلیمات سے اخذ کیا ہے۔ قرآن چونکہ ایک ملت کا تصور پیش کرتا ہے اس لیے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اقبال نے جہاں دیگر قرآنی نظریات کا پرچار کیا ہو وہاں انہوں نے ملتِ اسلامیہ کا تصور پیش نہ کیا ہو۔ بلکہ ''رموزِ بے خودی'' میں جو اشعار انہوں نے ''بحضور رحمت اللعالمین ﷺ'' کہے ہیں ان میں اس بات کو بطورِ خاص واضح کیا ہے کہ اگر میں قرآن کے علاوہ کچھ اور کہوں تو مجھے ختم کر دیا جائے اور امت کو میرے شر سے محفوظ رکھا جائے(۴۷)۔ چنانچہ قرآن میں کئی مقامات پر حضرت ابراہیمؑ کی نسبت سے ملت ابراہیمی اور امتِ مسلمہ کا ذکر آیا ہے،(۴۸) مثلاً:

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا ط (ال عمران:۹۵)

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ تم سب ملتِ ابراہیم حنیف کی پیروی کرو''۔

اس آیت میں اُمتِ محمدیہ ﷺ کو ملتِ ابراہیمؑ کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ ملتِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابراہیمؑ کی بنیاد رنگ ونسل اور وطنیت کے محدود جغرافیائی اور زندگی کے مادی تصور پر قائم نہیں بلکہ ایک ایسی عالمگیر وحدت پر قائم ہے جس کا مقصد انسانی فلاح اور کامرانی ہے۔ جس میں رہ کر انسانوں کو اچھے کاموں کی طرف بلایا جاتا ہے اور معاشرے کو ہر قسم کی برائی سے پاک رکھا جاتا ہے۔ اسی وصف کی بنیاد پر امتِ محمدیہ ﷺ کو بہترین امت بھی کہا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ
تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ ط (ال عمران: ۱۱۰)

ترجمہ: ''تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اقبال نے دینِ ابراہیمی کے وارث ہونے کو انسان کے احسن التقویم ہونے سے مشروط کیا ہے' فرماتے ہیں:

از شریعت احسنِ تقویم شو
وارثِ ایمانِ ابراہیم شو (۴۹)

اقبال نے قرآنی آیات کی روشنی میں ملتِ ابراہیمی کی ضرورت پر زور دیا ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سمیت تمام انبیائے کرامؑ ایک ملت کے آرزومند تھے اور یہی آرزو اقبال کے دل میں بھی تھی' فرماتے ہیں:

ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ
از ابیکم گر اگر خواہی دلیل (۵۰)

ملت کا قیام اقبال کے نزدیک رحمت بھی ہے:

تارکِ آفل براہیمِ خلیل انبیاء را نقش پائے او دلیل
آں خدائے لم یزل را آیتے داشت در دل آرزوئے ملتے (۵۱)
ما زِ حکمِ نسبتِ او ملتیم اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم (۵۲)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الحاصل، اقبال مسلمانوں کے سچے خیر خواہ تھے۔ وہ گروہ بندیوں اور نسلی امتیازات کو قوم کے لیے زہر قاتل قرار دیتے تھے۔ ان کے نزدیک امتِ مسلمہ کا عروج باہمی اتحاد و یکجہتی میں مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران:۱۰۳) کہہ کر تمام مسلمانوں کو قرآن سے منسلک ہو کر باہمی تفرقے سے باز رکھنے کا حل پیش فرمایا ہے اور اقبال نے قرآن میں تدبر کے ذریعے سے اسلامی اُمہ کے قیام پر زور دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک اسلامی اُمہ آج سے کئی صدیاں پہلے وجود میں آجاتی اگر قرآن میں تدبر کی روش کو اپنایا جاتا۔ فرماتے ہیں:

''اگر گزشتہ زمانے کے مسلمان، مدبرین اور سیاسیین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمیعتِ اقوام کو بنے ہوئے آج کئی صدیاں گزر گئی ہوتیں''۔ (۵۳)

فکرِ اقبال کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج بھی تمام دنیا کے مسلمانوں کی فلاح و بقا اور ان کے معاشرتی، سیاسی و تہذیبی حقوق کی حفاظت اس صورت میں ممکن ہے کہ نسلی، لسانی و گروہی اختلافات کو ختم کر کے مواخاتِ مدینہ جیسا بھائی چارہ قائم کیا جائے اور قرآن جس امت کا تصور پیش کرتا ہے اپنے آپ کو اس کا اہل بنایا جائے۔ حضور اکرم ﷺ کے اس فرمان پر پختہ یقین کیا جائے کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک جسدِ واحد کی طرح ہیں اور ہمیشہ اقبال کے اس فرمان کو مدنظر رکھا جائے:

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (۵۴)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوالہ جات وحواشی

(۱) سید عابد۔ شعر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۶۴ء ص ۵۔

(۲) کلیم نشتر، نظریات اقبال، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۸۸ء۔ص ۵۸۔

(۳) ڈاکٹر وحید قریشی۔ (مرتب) منتخب مقالات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء۔ص ۲۶۰۔

(۴) اقبال۔ بانگ درا، ص ۲۶۲ (کلیات اقبال، اردو، اشاعت چہارم۔ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۷ء)

(۵) مولانا سید ابوالحسن ندوی، نقوش اقبال، کراچی، ۱۹۷۹ء۔ص ۲۸۰۔

(۶) بانگ درا۔ص ۲۷۹ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۷) ایضاً۔ص ۲۸۸۔ایضاً۔

(۸) ایضاً۔ص ۲۴۳۔ایضاً۔

(۹) نسیم عباس۔ اقبال، عصری تناظر میں، المضراب پبلشرز، ملتان، ۲۰۰۵ء۔ص ۳۶۔ خدیجہ یاسمین ملک۔ فلسفۂ اقبال، المغنی بکس، ملتان، ۱۹۹۶ء۔ص ۳۳۔

(۱۰) ابوالحسن ندوی، نقوش اقبال۔ص ۲۸۰۔

(۱۱) بانگ درا۔ص ۱۷۰ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۱۲) ایضاً،ص ۱۷۱۔ایضاً

(۱۳) بحوالہ: ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ (مرتب)، اقبال: تصور قومیت اور پاکستان، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۸ء۔ص ۱۵۔

(۱۴) بانگ درا،ص ۲۸۴ (کلیات اقبال، اردو)

(۱۵) کلیم نشتر۔ نظریات اقبال۔ص ۶۹۔

(۱۶) بانگ درا،ص ۲۲۳ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۱۷) ایضاً،ص ۲۸۵۔ایضاً۔

(۱۸) قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء۔ص ۱۳۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۱۹) غلام احمد میاں پرویز، اقبال اور قرآن، جلد اول، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۸۷ء۔ ص ۲۱۰۔

(۲۰) ارمغان حجاز، ص ۶۲ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۲۱) اقبال، پیام مشرق۔ ص ۱۲۹ (کلیات اقبال، فارسی، طبع چہارم، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۱ء)۔

(۲۲) بال جبریل، ص ۴۲ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۲۳) بانگ درا، ص ۱۶۲ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۲۴) اسرار و رموز، ص ۱۱۲ (کلیات اقبال، فارسی)۔

(۲۵) ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔ ص ۸۴،۸۳۔

(۲۶) بانگ درا، ص ۲۰۱ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۲۷) بحوالہ: عبدالواحد معینی (مرتب) مقالات اقبال، لاہور، ۱۹۶۳ء۔ ص ۹۴۔

(۲۸) ضرب کلیم، ص ۱۸۷ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۲۹) بال جبریل، ص ۸۴ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۳۰) نصیر احمد ناصر، اقبال اور جمالیات، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی، ۱۹۶۴ء۔ ص ۴۴۔

(۳۱) زبور عجم، ص ۱۴۸ (کلیات اقبال، فارسی)۔

(۳۲) ارمغان حجاز، ص ۱۲۱ (کلیات اقبال، فارسی)۔

(۳۳) ڈاکٹر یوسف حسین خان، روح اقبال، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۴۹۔

(۳۴) اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، سید نذیر نیازی، مترجم، لاہور، ۱۹۸۳ء۔ ص ۱۱۰۔

(۳۵) بانگ درا، ص ۲۱۹ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۳۶) شیخ عطاءاللہ، اقبال نامہ، جلد اول، لاہور، سن ندارد۔ ص ۲۰۲۔

(۳۷) مثنوی، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق، ص ۳۷ (کلیات اقبال، فارسی)۔

(۳۸) سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، کراچی، ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۶۔

(۳۹) زبور عجم، ص ۱۸۰ (کلیات اقبال، فارسی)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۴۰) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ اقبال اور مسلک تصوف، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء۔ ص ۳۷۹۔

(۴۱) بحوالہ: رفیع الدین ہاشمی (مرتب) خطوط اقبال، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء۔ ص ۱۲۷۔

(۴۲) بحوالہ: بشیر احمد ڈار۔ (مرتب) انوار اقبال، اقبال اکادمی، کراچی، ۱۹۶۷ء۔ ص ۱۹۲۔

(۴۳) شیخ عطاء اللہ، اقبال نامہ، حصہ دوم، لاہور، ۱۹۵۱ء۔ ص ۴۸۔

(۴۴) بال جبریل، ص ۱۶۶ (کلیات اقبال، اردو)۔

(۴۵) غلام احمد پرویز، تصوف کی حقیقت، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۲ء۔ ص ۳۸۱۔

(۴۶) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ اقبال اور قرآن، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء۔ ص ۵

(۴۷) اسرار ورموز، ص ۱۶۸ (کلیات اقبال، فارسی)۔

(۴۸) حضرت ابراہیم کی نسبت سے امت مسلمہ یا ملت ابراہیمی کی اتباع کے لیے قرآن کے چند مقامات کی تفصیل اس طرح سے ہے۔ (البقرہ: ۱۲۸، النسآء: ۱۲۵، الانعام: ۱۶۱، النحل: ۱۲۰، ۱۲۳، الحج: ۷۸)۔

(۴۹) مثنوی: پس چہ باید کرد اے قوم شرق، ص ۳۱ (کلیات اقبال، فارسی)۔

(۵۰) اسرار ورموز، ص ۹۳ (کلیات اقبال، فارسی)۔

(۵۱) ایضاً، ص ۱۰۰، ایضاً۔

(۵۲) ایضاً، ص ۱۰۱، ایضاً۔

(۵۳) بشیر احمد ڈار، انوار اقبال، ص ۲۱۹۔

(۵۴) بانگ درا، ص ۲۱۴ (کلیات اقبال، اردو)۔

© rasailojaraid.com